انارکلی کی واپسی

ڈاکٹر خالد علوی

79۔ساؤتھ ایونیو،نئی دہلی،موبائل:9868181236

فلنیری اور کونور کا مشہور مقولہ ہے:

"Writing a novel in a terrilde experience, during which the hair often falls out and the teeth decay. I am always invited by people who imply that writing fiction is an scape from reality. It is a plunge into reality and it is very shocking to the system."

لب لباب یہ ہے کہ ناول لکھنے میں جگر کا خون کرنا پڑتا ہے۔ ناول لکھنا ایک بے حد خطرناک قسم کا تجربہ ہے۔ ناول کو سپرد قلم کرنے کے دوران اکثر مصنف اپنے خوبصورت بالوں سے محروم ہوجاتا ہے اور اس دنداں شکن ناول نگار کے دانت بھی زوال کی نذر ہوجاتے ہیں۔ ناول لکھنا حقیقت سے فرار نہیں ہے بلکہ حقائق میں فرق ہونے کے مترادف ہے اور ہر اچھا ناول اپنے معاشرے کے لیے ایک زلزلے کے جھٹکے کی طرح ہوتا ہے۔

یہ قول ایسے مصنّفین پر صادق نہیں اُترتا جو چند دنوں میں ایک ناول پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے ناولوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ ایسے ناولوں کا انجام بھی ظاہر ہے چند دن سے زیادہ ان کا تذکرہ نہیں ہوتا۔ایسے ناولوں پر جون ایلیا کا یہ شعر صادق آتا ہے:

حاصل کن ہے یہ جہان خراب
یہی ممکن تھا اتنی عجلت میں

آج کل اردو ناول پر افسوسناک حد تک پژمردگی چھائی ہوئی ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں میں مرزا اطہر بیگ کے ''غلام باغ'' اور شمس الرحمٰن فاروقی کے معرکہ آرا ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کے علاوہ دور دور تک کوئی قابل ذکر ناول نظر نہیں آتا۔ یوں تو ہر سال دسیوں ناول شائع ہوتے ہیں، جن میں سے بعض ناول تو میں اپنے طالب علموں کو بھی بطور تحفہ نہیں دیتا کہیں ان کو پڑھ کر ان کی زبان خراب نہ ہوجائے۔ حالاں کہ عموماً یہ ناول مجھے ڈاک کے ذریعے مفت ملتے ہیں اور ان کو انجام تک پہنچانا بھی میرے لیے ایک مسئلہ ہوتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' نے کافی حد تک اس محرومی کی تلافی کر دی، لیکن اس پر پھر کسی وقت اظہار خیال کروں گا۔ سر دست تو مرزا حامد بیگ کے ناول ''انارکلی'' کا تذکرہ مقصود ہے۔

غالباً جین آسٹن نے کہا تھا کہ ناول ہی وہ واحد صنف ہے جس میں کہانی، المیہ، تنقید، تاریخ اور شاعری کے لیے جگہ موجود رہتی ہے۔ مرزا حامد بیگ کا ناول ''انارکلی'' اس تعریف پر کلی طور پر کھرا اُترتا ہے۔ اس ناول کے لیے مرزا حامد بیگ نے اکیس سال تک اپنی راتوں کا خون کیا۔ اس ناول کا عرصۂ تحریر ۲۷/مارچ ۱۹۸۶ء سے ۱۳/جون ۲۰۱۷ء تک ہے۔ اس درمیان میں حامد بیگ نے اپنے موضوع سے متعلق بعض مضامین بھی شائع کرائے۔ غالباً ان مضامین کا مقصد عوام و خواص میں موضوع کو مانوس کرنا اور مزید معلومات حاصل کرنا رہا ہوگا۔ ''اردو ادب'' میں چند سال قبل اسی موضوع پر ان کا مبسوط مضمون شامل ہوا تھا جس کا ادبی حلقوں میں خیر مقدم تو خوب کیا گیا، لیکن نئی معلومات کے سلسلے میں ان کو مایوسی ہی ہاتھ لگی ہوگی۔ وجہ صاف ہے کہ برصغیر میں ''انارکلی'' کو محض تخیلی کردار مان لیا گیا تھا، ظاہر ہے اس پر بحث و تمحیص کا کوئی امکان نہ تھا۔

مغلیہ تاریخ کے ماہرین نے فلم 'مغل اعظم' کی نمائش کے بعد اس عہد کے بعض کرداروں کی طرف سنجیدگی سے توجہ کی۔ اکثر نہیں بلکہ تمام تر مؤرخین اِس نتیجے پر پہنچے کہ جودھا بائی اور ''انارکلی'' کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مغل تاریخ میں 'جودھ بائی' نام کی راجپوت رانی موجود ضرور ہے، لیکن وہ جہانگیر کی ملکہ تھی اور اکبر کے دوست 'موٹا راجہ' کی بیٹی تھی، 'انارکلی' بھی ایک لونڈی تھی ضرور، جس کی قبر لاہور میں موجود ہے، لیکن مؤرخین کی تحقیق کے مطابق وہ جہانگیر سے کم از کم چودہ سال عمر میں بڑی تھی۔ اس لیے شہزادہ سلیم (جہانگیر) سے اس کے معاشقے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس لیے دیوار میں چنوائے جانے کا بھی کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس لیے دیوار میں چنوائے جانے کا بھی کوئی سوال نہیں ہے۔

لاہور میں انارکلی بازار میں مطربا ؤں کی موجودگی سے بھی 'انارکلی' کے مغل دربار سے رشتوں کی بازیافت کی کوشش کی گئی۔ لاہور کا انارکلی بازار ایک زمانے میں طوائفوں کا بازار تھا۔ حد یہ ہے کہ جب حفیظ جالندھری نے اپنا دفتر انارکلی بازار میں شروع کیا تو تلوک چند محروم نے کہا:

دفتر جو بالا خانے میں دیکھا حفیظ کا
محروم سچ تو یہ ہے کہ دل شاد ہوگیا
رونق ہوئی انار کلی کی چہار چند
بازار سوز و ساز سے آباد ہوگیا

(سوز وساز، حفیظ جالندھری کے مجموعۂ کلام کا بھی نام تھا)۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ انارکلی کوئی مطربہ رہی ہوگی چونکہ وہ عمر میں شہزادہ سلیم سے چودہ سال بڑی تھی۔ اس لیے عشق اور عشق کے بعد کسی سزا کا کوئی امکان نہیں ہے۔ انارکلی پر اردو میں سب سے پہلے عبدالحلیم شرر نے مختصر سا ناول لکھا، لیکن 'انارکلی' کو امتیاز علی تاج نے اپنے ڈرامے کے ذریعے عوام و خواص سے متعارف کرایا۔ پردیپ کمار کی فلم 'انارکلی' اور کے۔ آصف کی ہدایت میں بنی فلم 'مغل اعظم' نے انارکلی کو لازوال شہرت بخش دی۔ 'مغل اعظم' فلم کا تاثر ہندوستانی ذہنوں پر اتنا دیرپا ثابت ہوا کہ اکبر، سلیم اور انارکلی کی جو تصویر مرتب ہوگئی اس میں تبدیلی آسان نہ تھی۔ حد یہ ہے کہ اکبر اعظم، جس کی شخصی تصویر جہاں گیر نے تفصیل سے 'تزک جہانگیری' میں بیان کردی ہے، پرتھوی راج کپور کے حوالے سے پہچانا جانے لگا۔ اکبر اعظم کا نام آتے ہی پرتھوی راج کی بھاری بھرکم شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ حالاں کہ جہاں گیر کے مطابق اکبر، پرتھوی راج کی طرح فربہ اندام نہیں بلکہ چھریرے بدن کا مالک تھا۔

اکبر کے عہد میں لکھی گئی ابوالفضل، فیضی اور ملاّ قادر بدایونی کی تصنیفات میں انارکلی کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ قادر بدایونی جذباتی طور پر اکبر کا سخت مخالف تھا اور اکبر کو بدنام کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑتا تھا، لیکن وہ بھی انارکلی کے ذکر سے دامن کشاں گزر گیا۔ مؤرخین نے بہت کم انارکلی کو قابل اعتنا سمجھا۔ جادو ناتھ سرکار نے سارا علم اورنگ زیب کی متعصب شخصیت کی صورت گری میں صرف کیا۔ حالاں کہ انھوں نے مغل شہزادوں کو دیے گئے تحائف، وظائف اور مناصب کی قیمت کا اندازہ بھی لگانے کی کوشش کی۔ عرفان حبیب اور شیریں موسوی بھی اس ذکر سے اجتناب کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کے۔ ایم اشرف انارکلی کو قطعی فرضی کردار مانتے تھے۔ ہربنس مکھیا نے اپنی کتاب میں 'انارکلی' کو قطعی فرضی کردار تو نہیں مانا، لیکن حقیقت بھی تسلیم نہیں کیا۔ وہ حقیقت اور افسانے کے بین بین راہ متعین کرتے ہیں۔ یعنی انارکلی اور جہانگیر کا عشق ناممکن نہیں تھا، لیکن کسی عصری ماخذ میں ذکر ہونے کی وجہ سے شک وشبہ کے دائرے میں آتا ہے۔ ہربنس مکھیا نے لاہور میں انارکلی کا مزار اور انارکلی بازار پر سوال کھڑے کیے ہیں، اگر وہ کوئی غیر اہم شخصیت تھی تو نمایاں مقام پر اس کا مزار چہ معنی دارد؟ ہربنس مکھیا نے انارکلی کے مزار پر کندہ شعر کا ذکر کیا ہے، لیکن اسے جہاں گیر سے منسوب کرنے پر احتیاط برتی ہے۔ کئی سال قبل الٰہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی نے ورلڈ ہسٹری کانگریس (بنارس) میں 'انارکلی' پر ایک طویل مقالہ پڑھا تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ انارکلی اور عشق جہانگیر محض افسانہ ہے۔ ابراہم اریلی نے مغلیہ دورِ حکومت پر تین کتابیں لکھی ہیں: Emperor of peacock throne، The Mughal world اور The Mughal Throne۔ دی مغل ورلڈ میں انھوں نے تفصیل سے انارکلی پر اظہار خیال کیا ہے، لیکن ان کا خیال ہے کہ اکبر کی ہر اچھی بری بات ابوالفضل اور ملا قادر بدایونی نے درج کردی ہے۔ انارکلی کا ذکر نہ ہونا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس کا وجود مشتبہ ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے ہی پروفیسر تر پاٹھی نے جہانگیر کے عہد پر ہی تفصیلی کام کیا ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جہانگیر اور نور جہاں کے عشق اور کبوتر اُڑانے کی تمام کہانیاں فرضی ہیں۔ علی قلی کے قتل کا الزام بھی جہانگیر پر نہیں لگایا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جہانگیر نے بیوہ ہونے سے قبل نور جہاں کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ تر پاٹھی بھی انارکلی کا کوئی واضح ذکر نہیں کرتے۔

ابراہم اریلی جو ہندوستانی مؤرخین میں اپنی بے لاگ اور ایماندارانہ رائے کے لیے مقبول ہیں، اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ 'انارکلی' شہزادہ دانیال کی ماں کے علاوہ کوئی دوسری شخصیت نہیں ہوسکتی۔ اریلی کا یہ بھی خیال ہے کہ ابوالفضل کا متذکرہ واقعہ جس میں ایک پاگل شخص اکبر کے حرم میں داخل ہوگیا تھا۔ دراصل سلیم کا اکبر کے حرم میں ناجائز طور پر داخل ہونے کا واقعہ ہے۔ سلیم ممنوعہ علاقے میں 'انارکلی' کی تلاش میں داخل ہوا تھا۔

لیکن اریلی کی تھیوری اس لیے قابل تسلیم نہیں ہے کہ شہزادہ دانیال کی ماں کی موت ۱۵۹۶ء میں ہوگئی تھی جب کہ انارکلی کو مبینہ سزائے موت ۱۵۹۹ء میں دی گئی۔

''لاہور — ماضی اور حال'' کے مصنف محمد باقر انارکلی کی کہانی کی وجہ تسمیہ محض اس باغ کی وجہ سے بتاتے ہیں جو لاہور میں 'انارکلی' کے نام سے منسوب ہے۔ اس باغ کا تفصیلی ذکر داراشکوہ نے 'سکینۃ الاولیا' میں کیا ہے

اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ میاں میرؔ اسی باغ میں قیام کرتے تھے۔ واضح رہے میاں میر داراشکوہ کے پیر تھے اور امرتسر کے 'گولڈن ٹیمپل' کی بنیاد بھی انھوں نے ہی رکھی تھی۔ محمد باقر کا خیال ہے کہ لاہور میں 'انارکلی' کا مزار، دراصل جہانگیر کی زوجہ صاحب جمال کا مزار ہے۔ صاحب جمال زین خاں کوکا کی دختر اور جہانگیر کے دوسرے بیٹے سلطان پرویز کی ماں تھی۔

تاریخ دانوں کے مباحثے میں الجھی 'انارکلی' کی کہانی کی ابتدا عبدالحلیم شرر اور امتیاز علی تاج کی تخلیقات کی اشاعت سے بہت قبل ہو چکی تھی۔ ایک برطانوی تاجر ولیم فنچ فروری ۱۶۱۱ء میں بسلسلہ تجارت ہندوستان آیا۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے ہندوستانی نیل (رنگ) خریدنا چاہتا تھا۔ جو اس وقت ہندوستانی دھوبی کسی پیڑ کی پتیوں سے کشید کرتے تھے۔ وہ تمام یوروپی ممالک میں دستیاب نیلے رنگ سے کہیں زیادہ خوبصورت اور ارزاں تھا اور راجستھان کے علاقہ بھرت پور میں دستیاب تھا۔ ولیم فنچ نے اپنی یادداشتوں میں لکھا:

''انارکلی اور سلیم میں گہرا تعلق تھا۔ جس کی اطلاع ہونے پر اکبر نے 'انارکلی' کو دو دیواروں کے درمیان محبوس کرا دیا۔ جہاں اس کی موت واقع ہوگئی۔ جہانگیر نے عنانِ سلطنت سنبھالنے کے بعد انارکلی کی موت کے مقام پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کرایا۔''

(ہندوستان میں ابتدائی سیاح، ولیم فاسٹر، آکسفورڈ پریس)

ولیم فنچ کے کچھ سال بعد ایک اور برطانوی سیاح ایڈورڈ ٹیری ہندوستان آیا۔ اس نے اپنی یادداشتوں میں لکھا کہ شہزادہ سلیم کے اکبر کی سب سے محبوب بیوی 'انارکلی' سے ناجائز تعلق استوار ہو گئے تھے۔ اس بنا پر اکبر نے شہزادہ سلیم کو عاق کرنے کی دھمکی دی تھی، لیکن بعد میں بستر مرگ سے سلیم کو معاف کر دیا۔ (Early Travels in India–Ed. William Fostor، ص:۱۲۲ تا ۱۸۷)

تاریخ دانوں کے رویہ تبدیل نظریات اور سترہویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں برطانوی سیاحوں کے بیانات کی افراط و تفریط نے 'انارکلی' کو بھی خواب پریشاں بنا دیا تھا۔ مرزا حامد بیگ کے تازہ ترین ناول 'انارکلی' نے نہ صرف اردو ناول کی کم مائیگی دور کر کے مزید باثروت کیا ہے بلکہ تاریخ بھی کلی طور پر تبدیل کر دی ہے۔ مرزا حامد بیگ نے دو دہائیوں تک اردو، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی کے تمام موجود و معلوم حوالوں تک رسائی حاصل کی اور اکبر کے عہد کے لاہور اور اس کے متعلقات پر نہایت دلجمعی کے ساتھ تحقیق و تفحص کیا۔ 'انارکلی' کے مزار پر کندہ شعر تقریباً تمام مؤرخین کی توجہ کا مرکز رہا ہے:

تا قیامت شکر گویم، کردگار خویش را
آہ! گر من باز بینم روئے یار خویش را

لیکن مرزا حامد بیگ نے عرفی کے دو شعر بھی تلاش کیے ہیں جن سے برطانوی سیاحوں ولیم فنچ اور ایڈورڈ ٹیری کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے:

ہمیشہ تا آں کہ نگردد حلال بر فرزند
جمیلہ تا کہ شود با پدر بہ حجلہ مقیم
عروس دہر بفتویٰ ذرّہ تا خورشید
حلال اکبر شاہ باد و شاہزادہ سلیم

(یہ طے شدہ امر ہے کہ حسینہ اس وقت تک بیٹے کے لیے حلال نہیں، جب تک وہ باپ کی خواب گاہ میں مقیم ہو، لیکن ہر ادنیٰ تا اعلیٰ سے حاصل کردہ فتویٰ کے ذریعے، وقت کی دُلہن بہ بیک وقت اکبر بادشاہ اور شہزادہ سلیم کے لیے حلال قرار پائی۔ ترجمہ: مرزا حامد بیگ)

مرزا حامد بیگ نے عرفی کے اشعار سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان اشعار میں انارکلی، اکبر اور جہانگیر کی تثلیث کی طرف اشارہ ہے۔ عرفی کو زہر دے کر قتل کیا گیا تھا، عام طور سے عرفی کے قتل کی ذمہ داری فیضی کے سر ڈالی جاتی ہے، لیکن حامد بیگ کا خیال ہے کہ عرفی کو ان اشعار کی وجہ سے سلیم یا اکبر نے قتل کرایا تھا۔ انارکلی کا اصلی نام شریف النساء بیگم اور عرفیت نادرہ بیگم تھی۔ جہانگیر نے نہ صرف اپنی بیٹی کا نام نادرہ بیگم رکھا بلکہ اپنے دو بیٹوں شاہجہاں اور شہزادہ پرویز کی بیٹیوں کا نام بھی نادرہ رکھا۔ اس اہم نکتہ کی طرف بھی پہلی بار حامد بیگ نے توجہ منعطف کرائی ہے۔

تاریخی واقعات سے حامد بیگ کے استخراج نتائج پر اختلاف کی گنجائش ہے۔ مثلاً عرفی کے دونوں اشعار سے وہ معنیٰ تو برآمد ہوتے ہی ہیں جس پر حامد بیگ نے اپنے ناول کی بنیاد کھڑی کی ہے، لیکن اس کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اگرچہ کوئی حسینہ بیک وقت باپ اور بیٹے پر حلال نہیں ہو سکتی، مگر وقت کی دُلہن بیک وقت دونوں پر یکساں طور پر مہربان ہے، اسی لیے دونوں کا ستارہ عروج پر ہے۔ عرفی کا انتقال ۱۵۹۱ء میں ہوا۔ انارکلی مبینہ طور پر ۱۵۹۹ء میں زندہ درگور کی گئی۔ اگر عرفی کے زمانے میں سلیم اور انارکلی کا عشق زبان زد خاص و عام تھا تو یہ بات بھی قرین قیاس نہیں ہے کہ تقریباً نو سال تک عشق چلتا رہا اور اکبر نے نو سال کے بعد انارکلی کو زندہ درگور کیا، لیکن مرزا حامد کے ناول کی اہمیت اور خوبصورتی پر کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ناول تاریخی ہوتے ہوئے بھی جدید ہے۔ انارکلی اور سلیم کی عشقیہ کہانی کے متوازی شہریار مرزا اور شاذیہ کی کہانی ناول کو ہمارے عہد میں لے آتی ہے۔ اس ناول میں معلومات کا

جس قدر خزانہ موجود ہے اس کی تحسین بھی مشکل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جس خوش اسلوبی سے موسیقی، فن تعمیر اور تاریخی واقعات کو ناول کا جز بنا دیا ہے وہ کہیں بھی قاری پر بار محسوس نہیں ہوتا، بلکہ قاری یک گونہ مسرت محسوس کرتا ہے۔

ابتدا میں مؤرخین کے انارکلی پر نظریات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ ناممکن ہے کسی تاریخ داں نے انارکلی پر اظہار رائے کیا ہو اور مرزا حامد سے نظر انداز ہو گیا ہو۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ کسی اردو ادیب نے 'انارکلی' سے قبل فن تعمیر کی تفصیلات کو اپنی تخلیق کا حصّہ بنایا ہوں۔ ناول 'انارکلی' میں مغل عہد کا مکمل لاہور موجود ہے۔ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ لاہور کا شالیمار باغ، شاہجہاں کے عہد کا ثمرہ ہے، لیکن حامد بیگ نے ثابت کیا ہے کہ یہ باغ اکبر کے عہد میں بھی موجود تھا۔ شاہجہاں نے اس کو مزید خوبصورت بنایا تھا۔

قدیم اردو شعرا بالخصوص اٹھارہویں صدی کے شعرا سوداؔ، دردؔ، میر حسن اور قائم کو موسیقی پر کافی دسترس حاصل تھی۔ ہمارے زمانے میں عمیق حنفی کی ایک کتاب بھی موسیقی کے فن پر موجود ہے۔ اس کے باوجود اردو میں موسیقی کے سلسلے میں کچھ زیادہ مواد دستیاب نہیں ہے۔ حامد بیگ نے اس محرومی کی بھی تلافی کر دی ہے۔ 'خیال'، 'ابھوگ'، آروہی، امروہی، استھائی سر، راگ درباری، راگ کرناٹ، درباری کا نڑا، سرسنگھار اور سردھیوت کی تفصیلات مکمل نغمگی کے ساتھ موجود ہیں۔ انارکلی کے ہم عصر مغنی شاہ حسین کی ٹھمری بھی انارکلی کے حبس دم کے ثبوت کے طور پر موجود ہے۔

اکبر کا دین الٰہی اگرچہ ناول کے موضوع سے براہ راست متعلق نہیں ہے، لیکن ضمنی طور پر ہی سہی اس کا ذکر بھی اس طرح موجود ہے کہ اکبر کی وسیع المشربی کے ساتھ راجہ مان سنگھ کی اپنے مذہب سے عقیدت بھی سامنے آتی ہے جب وہ دین الٰہی اختیار کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ حامد بیگ کا خیال ہے کہ مذہبی جبریت مسلط کرنا کبھی مغلوں کا شیوہ نہیں رہا۔ اکبر کے عہد میں جنوبی ہند میں رامانند، بنارس کے کبیر اور ولبھ آچاریہ، مہاراشٹر کے نامادیوی اور تلونڈی، شیخوپورہ پنجاب کے گرونانک جیسے بھگتوں نے ہندو، ترک، جین، جوگی کا فرق مٹا کر محبت اور ایثار کا درس دیا۔ اور ہندو مسلمانوں نے ایک دوسرے کی بہت سی رسمیں اختیار کر لیں۔ مذہبی رواداری کے ضمن میں اکبر کی مثال تو روشن ترین استعارہ ہے، لیکن حامد بیگ نے شاہجہاں کے بعض واقعات کو نظر انداز کر دیا ہے جس کی مثال ابوصالح کمبوہ نے شاہجہاں نامہ میں دی ہے، جن سے شاہجہاں کی مذہبی تنگ نظری ثابت ہوتی ہے۔

اکبری عہد کے بعض موقع پرست مذہبی ائمہ اور علما نے جس طرح مذہبی فتاویٰ کا دینوی مقاصد کے لیے ناجائز استعمال کیا، اس ناول میں اس کی تفصیل بھی موجود ہے۔ کس طرح مذہبی پیشوا شیخ تاج الدین نے اعلان کیا کہ بادشاہ، چوں کہ ظل الٰہی ہے، اس لیے اس کو سجدہ کرنا جائز ہی نہیں واجب ہے۔ مفتی ابراہیم نے فتویٰ دیا کہ شیر اور چیتے کا گوشت حلال ہے اور مردوں کو ریشمی لباس اور سونا استعمال کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔

قاضی نظام بخشی نے اکبر کو سجدہ کرنے کا جواز پیش کیا تو ملا عالم کابلی نے حسرت کا اظہار کیا کہ کاش یہ فضیلت انھیں حاصل ہوتی۔

ناول میں جہاں 'انارکلی' کی تمام تفصیلات موجود ہیں، وہیں اکبر کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ ادھم خاں نے جب اکبر کے وزیر شمس الدین کو قتل کیا تو اکبر نے ایک نہایت غلیظ ہندوستانی گالی سے نوازا تھا۔ ہربنس کھیا، شیریں موسوی اور بعض دوسرے مورخوں نے وہ گالی بعینہٖ نقل کر دی ہے، لیکن حامد بیگ نے گالی کا حوالہ دینے سے تو اجتناب کیا ہے، لیکن تفصیل درج کر دی ہے۔

.....چھریرے بدن، چوڑی چھاتی اور لمبے ہاتھ پاؤں والا اکبر، طاقتور اتنا تھا کہ جب دو سپاہیوں کو بغل میں داب کر قلعہ کی فصیل پر دوڑ لگاتا۔ تبھی تھکن محسوس کرتا، بہ صورت دیگر نہیں۔

مدّ مقابل کو مکا مارتا تو اس کا ایک ہی مکّا مدّ مقابل کی جان لینے کے لیے کافی ہوتا۔ جب وہ تھپڑ مارتا تو مدّ مقابل کی گردن کے مہرے ٹوٹ جاتے تھے۔

.....ادھم خاں نے شمس الدین کو قتل کر دیا۔ رات کو یہ خبر سن کر اکبر شب خوابی کے لباس میں جائے حادثہ پر پہنچ گیا۔ جہاں ادھم خاں موجود تھا۔ اکبر اسے دیکھتے ہی چنگھاڑا ''ادھم خان''

اکبر کی آواز میں کیا دبدبہ تھا کہ ادھم خان کے ہاتھ سے تلوار گر گئی اور وہ خوف سے کانپنے لگا۔'' (انارکلی، ص: ۵۰)

اکبر نے اپنے جہل کی تلافی کے لیے لاتعداد علمی کام بھی کرائے۔ اس نے ملّا عبدالقادر سے 'مہابھارت' اور 'رامائن' کے فارسی تراجم کرائے۔ ملّا احمد ٹھٹھوی نے 'تاریخ الفی'، فیضی نے 'نل ودمن' اور محمد شاہ آبادکاشمیری نے 'تاریخ کشمیر' قلمبند کیں۔ 'چنگیز نامہ'، 'داستان امیر حمزہ'، 'ظفر نامہ'، 'اکبر نامہ'، 'رزم نامہ'، 'رامائن'، 'مہابھارت'، 'قصّہ نل ودمن'، 'عیار دانش' اور 'کلیلہ ودمنہ' کے قلمی نسخوں کو میر سید علی تبریزی، عبدالصمد شیریں قلم، برہنس کیسو لعل جیسے مصوروں اور خطاطوں نے آراستہ کیا۔

اکبر کا کسی جرم کی تہہ تک پہنچنا اور تفتیش کا اپنا طریقہ تھا۔ حامد بیگ نے اس سلسلے میں بھی تفصیلات بیان کردی ہیں۔

''ملزم پر نفسیاتی دباؤ ڈال کر جرم ثابت کرنے کے کئی طریقے رائج تھے۔ اوّل یہ کہ ملزم کو ترازو میں تول کر نیچے اُتار دیں اور کچھ وقت اس کو اپنے اعتقاد اور طریق سے عبادت کرنے کا موقع دیں۔ اس کے بعد اس کو دوبارہ تولیں۔ اگر ملزم کے وزن گھٹنے سے اس کے ترازو کا پلڑا بلند ہوجائے تو وہ بے گناہ ہے۔ بہ صورت دیگر وہ مجرم ہے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ سات مقامات پر دائرہ کھینچیں، ہر دائرے کا فاصلہ ایک دوسرے سے سولہ انگشت سے کم نہ ہو۔ ملزم کو غسل کروا کر عبادت کا موقع دیں۔ اس کے بعد ملزم کے ہاتھ پر دھان کی بھوسی مل دی جائے، اس کے سامنے کی طرف پھیلے ہوئے ہاتھوں پر سات سیر پیپل کے پتّے رکھ کر کچی ڈور کے ساتھ پیپل کے پتّے اور ملزم کے ہاتھ لپیٹ دیں۔ اب لوہے کا ٹکڑا، جس کا وزن تین سیر ایک پاؤ چھ تولہ ہو، آگ میں سرخ کر کے اس کے ہاتھوں میں تھامے ہوئے پتّوں پر رکھ کر اس سے کہیں کہ زمین پر کھنچے ہوئے دائروں میں قدم رکھتا ہوا آگے بڑھے۔ اگر ملزم یا ملزمہ ساتوں دائرے عبور کر جائے اور اس کے ہاتھوں پر جلنے کا نشان نہیں آئے تو وہ راست گو ہے اور اسے الزام سے بری کردیا جائے گا۔''

غیر معمولی دلچسپ نثر میں لکھا ہوا یہ ناول اپنی تخلیقی قوت، تاریخی معلومات اور مسحور کن کہانی کے لیے یاد رکھا جائے گا۔ لاتعداد تفصیلات سے مخزونہ 'انارکلی' میں بعض بے حد معمولی فروگزاشتیں بھی درآئی ہیں۔ مثلاً حسن سنجری کا شعر:

ہر قدم راست راہے، دینے و قبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم، ہر سمت کج کلاہے

امیر خسرو سے منسوب ہوگیا ہے (ص:۵۸) اس میں شک نہیں 'ریاض الشعراء' اور بعض دوسرے تذکروں میں یہ شعر خسرو سے منسوب ہے۔ رامانند کو جنوبی ہند کا سنت بتایا گیا ہے۔ (ص:۴۸) جب کہ یہ الٰہ آباد کے رہنے والے تھے اور بنارس میں مقیم رہے۔ کبیر اور روی داس جیسے سنتوں کے گرو تھے۔ کبیر نے ایک دوہے میں بھی ان کا ذکر کیا ہے:

کاشی میں ہم پرگٹ بھئے ہیں رامانند چیتائے جودھا بائی اور مریم زمانی میں خلط ملط ہوگیا ہے۔ (ص:۶۰) اکبر کی کوئی رانی جودھا بائی نہیں تھی۔ جودھ بائی ایک راجپوت شہزادی تھی جو جہانگیر کی بیوی تھی۔ مغل اعظم میں بڑے غلام علی کو پچاس ہزار نہیں (ص:۱۷۷) صرف پچیس ہزار روپے معاوضہ دیا گیا تھا۔ اس وقت محمد رفیع کو ایک فلمی گیت کا معاوضہ صرف چند سو روپے ملتا تھا۔

موسیقار نوشاد نے اپنی خودنوشت میں اس کی تفصیل لکھ دی ہے۔

حامد بیگ کی نثر دلکش اور خوبصورت ہے۔ بعض مقامات پر علاقائی اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ جب علامہ اقبال علاقائی اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے تو حامد بیگ ہی کیوں احتراز کرتے۔ اس طرح ان کی زبان حقیقت سے زیادہ قریب ہوگئی ہے۔

آج تک برصغیر میں مرزا حامد بیگ کی ایک افسانہ نگار اور محقق کی حیثیت سے شناخت قائم تھی۔ انارکلی کی اشاعت کے بعد وہ اردو کے معدودے چند اہم ناول نگاروں میں شامل ہوگئے ہیں۔ برصغیر میں 'انارکلی' کی جس طرح پذیرائی کی جارہی ہے اور مختلف زبانوں میں تراجم کیے جا رہے ہیں، ہمیں اُمید ہے مرزا حامد بیگ کے قلم کو مہمیز کرنے کے لیے کافی ہیں اور وہ جلد ہی مزید ناولوں سے اردو فکشن کو باثروت کریں گے۔ 'انارکلی' ناول صرف ادبی قدر و قیمت کی وجہ سے اہم نہیں ہے بلکہ 'انارکلی' کی اہمیت یہ بھی مسلم ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد مؤرخین کو 'انارکلی' کے ضمن میں قائم کردہ اپنی آرا پر از سرنو غور کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

اس ناول میں 'انارکلی' اور 'سلیم' کے عشق کی لافانی داستان کی از سرنو بازیافت تو کی گئی ہے ساتھ ہی شہریار مرزا اور شاذیہ کے ہلکے پھلکے عشق کی داستان بھی متوازی طور پر بیان کی گئی ہے۔ ہوسکتا ہے حامد بیگ نے اپنے ہیرو کا نام 'شہریار' شعوری طور پر منتخب کیا ہو چوں کہ 'شہریار' دودمان تیموریہ کا پسندیدہ نام تھا اور تقریباً ہر نسل میں کئی شہریار موجود تھے، لیکن یہ شہریار اپنی بعض کوتاہیوں کے باوجود اپنے متقدمین سے اس معنیٰ میں برتر ثابت ہوتا ہے کہ اس کی محبوب شاذیہ کو سماج محبوس نہیں کرسکا۔ شاذیہ ایک سماجی شخصیت ہے جو صدیوں کے بعد 'انارکلی' کو انصاف دلانے کی کوشش کرتی ہے۔

'انارکلی' سے مظفر حسین سید کا یہ قول بخوبی ثابت ہوجاتا ہے:

''مرزا حامد بیگ کے جدلیاتی ذہن کو اکہرے مطالب نکالنے والوں سے وحشت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ سہولت کا کوئی بھی راستہ بسا اوقات ممکن ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ زندگی اور ادب کے ازلی اور ابدی تقاضے بے حد مضبوط اور باریک گرہ سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ناخن تدبیر کے ساتھ گنجلک کو کم کرنا اس کو بھی آتا ہے، مگر وہ آخری اور لازمی گرہ کھولنے کی کوشش نہیں کرتا۔ کیوں کہ اس کو توڑے بغیر کھولا ہی نہیں جاسکتا۔''

◆◆◆